

التربية في الاسلام

تحریر: الشیخ محمد رضا الشیبی رحمہ اللہ ترجمہ: سید محمد کبیر احمد مظہر، ایم۔ اے

قومی تعلیم و تربیت کے بارے میں عالم اسلام کی مساعی عرصہ دراز سے اب تک مختلف قسم کے نقطہ نظر سے جاری رہی ہیں۔ ان میں سے بعض نظامِ قدیم اور جامد ہیں، جو اس دور کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں اور ترقی پسندانہ مقاصد کو پورا نہیں کرتے۔ بعض نظامِ جدید ہیں جن میں ہم نے حرف بحرف مغرب کی تقلید کی ہے اور بعض نظامِ ان دونوں کے بین بین ہیں۔ کئی اسلامی ممالک نے ایسی ہی نظاموں کو اس طرح من و عن قبول کر لیا ہے کہ اب ان کی قومی تربیت اور کردار سازی میں اپنے ماضی سے ان کا کوئی رشتہ باقی نہیں رہا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ مغربی یونیورسٹیوں پر تسلیم پانے والے ہمارے نوجوان جب مشرقی ممالک میں واپس آتے ہیں تو ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ملک کی نسبت بیرونی ممالک کے متعلق زیادہ وسیع معلومات رکھتے ہیں۔ انہیں اپنی ملی تاریخ کی نسبت دیگر اقوام کی تاریخ پر زیادہ عبور ہوتا ہے۔ اور وہ اپنے ہم وطن افسروں کے ماتحت کام کرنے کی نسبت بیرونی سرپرستی میں ملازمت کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔

اس میدان میں مسلمانوں کی مساعی کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگانے میں مغرب کے بعض مفکرین نے فاش غلطیاں کی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ قوم نقالوں کی ایک جماعت ہے۔ لہذا اس کے ان اندر فکر و عمل کی تلاش بے سود ہے۔ انہیں یہ وہم لاحق ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کا قدیم نظامِ تعلیم نئے برگ و بار پیدا کرنے کے قابل نہیں رہا۔ چونکہ اس کا دار و مدار تمام تر حفظ اور اعادہ پر ہے۔ اس لئے یہ نظامِ جدید فکر و نظر کے مطابق ہمیں کوئی نئی چیز نہیں دے سکتا۔

اس مضمون میں ہمارا مقصد ان باطل خیالات کی لغویت کو ظاہر کرنا ہے اور ان عظیم مساعی کا دفاع کرنا ہے جو ہم سے پیش رو تربیت کاروں نے نوجوانوں میں اعلیٰ اخلاقی اصول کی آبیاری اور بلند افکار کی پرورش کے لئے کیں۔ اس وجہ سے اس بحث کا ایک متوازن تاریخی جائزے کی صورت اختیار کر لینا

زیادہ ترین قیاس ہے۔ لیکن یہ جائزہ قدیم مشرق و مغرب کے ہر دو حصوں میں تعلیم و تربیت کے مختلف نظاموں اور طریقوں کے باہمی موازنہ سے خالی نہ ہوگا۔ کیونکہ اس وقت کے عالم اسلام میں تعلیم و تربیت کے اسالیب یکساں نہ تھے۔ بلکہ ان میں کثیر اختلافات موجود تھے۔ جن کی وجہ سے مشرقی اور مغربی اسالیب میں امتیاز کو ناچندان شکل نہ تھا۔ مگر یہ اختلافات بھی اکثر اوقات اساسی نہ تھے۔ اس لئے تربیت کے ان نظاموں میں اگر ایک طرف عملیت و واقعیت کے پہلو نمایاں تھے تو دوسری طرف نظریت و مثالیات کو بھی پیش نظر رکھا گیا تھا۔ اور اگر ایک طرف ابتدائی درجات میں روزمرہ زندگی کی ضروری تعلیم کا لحاظ رکھا گیا تھا تو دوسری طرف انتہائی جماعتوں میں وسیع اور دقیق علمی مباحث کو بھی اہمیت دی گئی تھی۔ اسلام کی عظمت کا تاج محل — جس تعلیم کی بنیادوں پر استوار ہوا، وہ اسلامی تعلیم تھی۔ اور مسلمان ماہرین تعلیم کے فیض سے اس کے اثرات پوری امت کے دلوں میں زاسخ ہو گئے تھے۔ وہ صدق مقال، اخلاص عمل اور استقامت کے بارے میں لوگوں کا محاسبہ و مواخذہ کیا کرتے تھے۔ اور انہیں مردانگی، ضبط نفس اور عوامی بہبود کے لئے باہمی تعاون اور اتفاق کی طرف دعوت دیتے تھے۔ انہوں نے حریت و مساوات کی قدر و منزلت کو دوبلا کر دیا اور اس شعور کی ترویج میں کوشاں رہے کہ نو و معرفت سے بہرہ ور ہونا سب سے بڑی خوش نصیبی ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ امت مسلمہ کی عظمت کا وہ بہ تمام عالم پر چھا گیا۔ عوام کو قانون سے طلبی رابطہ ہو گیا اور وہ ہر وقت اس کی اطاعت و پیروی پر آمادہ رہنے لگے۔ وہ عند الطلب آزادانہ اظہار رائے کرتے اور بوقت ضرورت جود و سخا میں کمی نہ کرتے۔

دور حاضر کی طرح زمانہ قدیم میں بھی عالم اسلام میں تعلیمی درجات تین ہی تھے :-

(۱) - ابتدائی تعلیم - (۲) - ثانوی تعلیم - (۳) - جامعہ یا یونیورسٹی کی انتہائی تعلیم۔

ان درجات کے لئے خاص نظام اور تعلیمی طریقے وضع کرنے اور مضامین کے مناسب نصابی کتابوں کے انتخاب میں مقتدر علماء نے ترتیب پر خاص توجہ دی۔ اور اس موضوع پر علمی کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں سے بعض اہل مشرق ہیں جو عراق، شام، خراسان اور ماوراء النہر میں پیدا ہوئے۔ اور بعض اہل مغرب

یہاں اہل مشرق اور اہل مغرب کی تقسیم موجودہ عام تقسیم سے مختلف ہے۔ اس میں بلاد اسلامیہ کو دو حصوں میں تقسیم

کیا گیا ہے جن کے لئے مصنف نے مشارق اور مغارب کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ (ادارہ)

مصر، اندلس، افریقہ اور مغرب اقصیٰ میں فن تعلیم و تربیت کے ماہرین کے نام سے مشہور و معروف ہوئے۔ قیروان اپنے سنہرے دور میں قرطبہ سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اور دیار مغرب کے طلبہ اکثر تعلیمی غرض سے اسی شہر کو اپنی منزل مقصود بناتے تھے۔ تعلیمی میدان میں ان کے اثرات ایک دوسرے سے مختلف تھے، اور ہر دو کا مزاج و منہاج اپنا اپنا تھا۔

المدرستہ المغربیہ :- اس دور میں مسلمان ماہرین تعلیم و تربیت کے بعض تحقیقی رائے مشرق و مغرب میں قبول عام حاصل کر گئے تو انہیں اسباق کی شکل میں مدون کیا گیا اور ان پر حواشی تحریر کئے گئے۔ چنانچہ ہمارے بعض محققین کی تحقیق کی رو سے بچوں اور نوا آموز طلبہ کی ابتدائی اور اسی تعلیم کے متخصص (SPECIALIST) تربیت کار بلاشبہ اولاً اندلس، قیروان اور افریقہ کے مغربی مدرسہ سے نسبت رکھنے والے ہیں۔ اور اس کے بعد ثانیاً مصری مدرسہ سے تعلق رکھنے والے۔ لہذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مغربی مدرسہ تعلیم بچوں پر انتہائی توجہ دینے میں ممتاز ہے۔ لیکن اس مدرسہ پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے۔ یعنی اس کا سب سے بڑا عیب یہ بتایا جاتا ہے کہ اس کی تمام تر توجہ حفظ اور تکرار پر مرکوز تھی۔ اور بحث و تھمیں اور استقلال پر بہت کم دھیان دیا جاتا تھا۔ نتیجہ تربیت کا یہ طریقہ بسا اوقات بے ثمر اور بے اثر ثابت ہوا۔ بحث و تحقیق کے طریقہ پر تربیت کرنے والوں نے مغربی مدرسہ کی اس کمزوری کو بہت محسوس کیا۔ اور اس پر سختی سے گرفت بھی کی۔ انہوں نے اس طریقہ تعلیم پر اہل شرق کے طرز تعلیم کو فضیلت دی ہے۔ جس کی خصوصیات مسائل کے افہام و تفہیم پر زور دینا۔ وقت نگاہ۔ الشرح صدر اور وسعت ذہنی ہیں۔

بعض ماہرین نفسیات کی رائے میں کثرت حفظ کے فوائد بھی ہیں۔ کیونکہ عرصہ گزر جانے کے بعد بھی حفظ شدہ اشیاء کے نقوش حساس باطنی پر متمم ہو کر باقی رہ جاتے ہیں۔ یہ نقوش ملکہ سازی میں ایک اہم عامل کا کردار ادا کرتے ہیں، خصوصاً فنون ادبیہ کے لئے ملکہ سازی میں بلکہ مجملہ تعمیر ثقافت میں بھی۔ اس بارے میں ابن خلدون کے نظریات نہایت بیش قیمت ہیں۔ کیوں کہ ادب و بلاغت کا ملکہ پیدا کرنے اور نظم و شعر پر عبور حاصل کرنے میں اس کا ایک خاص مذہب ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ملکہ سازی کے لئے قوانین عربیہ مثلاً صرف، نحو، بلاغت اور بیان وغیرہ کافی نہیں۔ بلکہ اس کے حصول کے لئے نظم و شعر سے چیدہ چیدہ کلام بکثرت حفظ کرنا اور اس کے اسالیب کی مشق و ممارست بادی

ہے۔ یہ طریقہ اس طالب علم کے لئے دشوار گزار ہے جس نے اصول و قواعد زبان پر ضرورت سے زیادہ توجہ دی ہو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے نحوی، عربی زبان کے ماہر اور قواعد و قوانین میں غرق رہنے والے بسا اوقات کسی مضمون کی ادائیگی کے لئے دو سطریں بھی صحیح نہیں لکھ سکتے۔ اور ضرور غلطی کرتے ہیں۔ یہ قول ابن خلدون کا ہے لیکن اس کی تائید تجربہ سے ہوتی ہے۔

دونوں مناہج کے مابینے موازنہ:- اہل مغرب نے نو عمر بچوں کی تعلیم و تربیت پر زیادہ توجہ دی۔ اور ابتدائی مراحل تعلیم کے لئے نظام وضع کرنے اور مضامین کے مطابق انتخاب کتب میں اپنی تمام تر مساعی کو صرف کر دیا۔ ان امور پر اگرچہ اہل مشرق نے بھی توجہ دی لیکن ان کی یہ توجہ ان کی اس توجہ کی نسبت بہت کم تھی جو انہوں نے یونیورسٹی کے اعلیٰ تعلیمی مراحل کی جانب مبذول کی۔ چنانچہ جامعی تعلیم کی طرف ان کا یہ انہماک بلاشبہ اس سارے دور میں بے مثال اور بے نظیر تھا۔

میسری صدی ہجری کے مغرب میں ایک نام محمد بن سحنون کا ہے جس نے اپنی مشہور کتاب ”آداب المتعلین“ لکھی۔ اور ان کے بعد ہر آنے والے مؤلف نے اس پر حاشیہ چڑھایا۔ اس لئے بچوں کی تعلیم کے موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں میں اس کتاب کو اولیت حاصل ہے۔ چوتھی صدی ہجری میں القابی القیروانی نے بھی اسے پڑھا اور اس کی مدد سے اپنی کتاب ”الرسالۃ المفصلۃ للاحوال المتعلین والمتعلین“ تالیف کی۔ اس کتاب میں انہوں نے ابن سحنون کی کتاب سے کثیر حداثات اور حوالے نقل کئے ہیں۔ علاوہ ازیں تشریح و تفصیل کی رو سے بھی اسے ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ چنانچہ ہمارے بعض محققین کی یہ رائے ہے کہ اس پوری صدی میں لکھی جانے والی کتابوں کی نسبت سب سے زیادہ تفصیلات اسی کتاب میں پائی جاتی ہیں۔ اور اسی لئے اس دور میں تعلیم کو دکان کے مختلف رائج الوقت مناہج کو سمجھنے کے لئے یہ کتاب بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب اسلامی تربیت کے موضوع پر دیگر سب کتابوں سے زیادہ مکمل ہے۔ یہ کتاب علوم قرآنیہ اور ان کی مدرسوں کے بارے میں بصورت سوال و جواب لکھی گئی ہے۔ اور اس میں علوم قرآن کی مدرسوں کے لئے اہم اضافی علوم کی طرف نشاندہی کرتے ہوئے مختلف مناہج و آراء کا بیان ہے۔ خلائے اندس کے تربیت کار تعلیم قرآن میں شعر و ادب اور کتابت و حساب وغیرہ کے عمل دخل کو باعث حرج نہیں سمجھتے تھے۔ حالانکہ افریقہ و قیروان کے بعض محدثین خصوصاً متقدمین صرف قرآن حکیم پر انحصار کرتے تھے۔ اور اس کی تعلیم ختم کر لینے کے بعد شعر و ادب اور کتابت کی تعلیم کا آغاز

کرتے تھے۔ ابن خلدون نے اس موضوع پر اچھی داد تحقیق دی ہے اور دونوں نقطہ ہائے نظر کا تفصیل سے موازنہ کیا ہے۔ اور آخر میں ابتدائی مراحل میں قرآن حکیم کی تعلیم پر اکتفاء کرنے والوں کے قول کو ترجیح دی ہے۔ چوتھی صدی ہجری میں القاسمی القیروانی کے زمانے میں ہی محدث ابن عبدالبر القرطبی نے جامع اشتات العلم وفضلہ تالیف کی اور اس میں اسلاف محدثین کے طریقے کی پیروی کی۔ حالانکہ یہ حقیقت محتاج بیان نہیں کہ تربیت میں طریقہ محدثین کے التزام سے ایک قسم کا جود پیدا ہو جاتا ہے۔

اس طبقہ کے بعد برحان الدین زرنوجی آئے۔ وہ ماوراء النہر کے رہنے والے ترک تبار ہیں اور اہل مشرق کے نزدیک تعلیم اطفال میں اپنے طریقے کے امام ہیں۔ انہوں نے اس موضوع پر اپنی کتاب ”تعلیم المتعلم وطریق التعلیم“ لکھی ہے جس سے ترکیہ کے علاقہ جات ماوراء النہر اور باقی بلاد اسلامیہ کے اساتذہ اور ماہرین تعلیم نے بہت استفادہ کیا۔ زرنوجی نے اس میں متعلمین کے لئے نہایت بیش قیمت ہدایات درج کی ہیں۔ مثلاً:-

”طالب علم کے لئے ضروری ہے کہ ہر وقت استفادہ کے درپے رہے۔ اس مقصد کے لئے اُسے ہر وقت اپنے پاس قلم دوات وغیرہ رکھنی چاہیے تاکہ جہاں کوئی علمی بات سنے فوراً قلم کر لے۔ چنانچہ داناؤں کا قول ہے:- جو چیز یاد کی گئی بھاگ گئی اور جو بات تحریر کر لی گئی ٹھہر گئی۔“

شیخ زرنوجی کے حالات زندگی کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں ہے۔ اور نہ ہی ہمیں ان کی کوئی مکمل سوانح حیات ملے ہے۔ ہماری نگاہ میں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کی نفی کرنے میں اتنا تک پہنچ گئے تھے۔ اور عزالت و گمنامی کی طرف حد درجہ مائل تھے۔ ان کا رسالہ استناد نصوح اور طریق تطبیق کی رو سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اپنی رائے کو نظائر و

لہ زرنوج۔ یہ نام زرنوق یعنی قاف کے ساتھ زیادہ مشہور ہے۔ جو ترکستان کی عمل داری میں ماوراء النہر کا ایک شہر ہے اور غنجد کے ساتھ واقع ہے۔ یا قوت حموی نے معجم البلدان میں اتنا ہی لکھا ہے۔ جب کہ السمعانی نے کتاب الانساب میں اس لفظ کا قطعاً ذکر نہیں کیا۔

شواہد سے مضبوط کرنے کے درپے رہتے ہیں۔ ان کا حال اس ماہر تربیت جیسا ہے جو شاہد و عمل کے دونوں وسائل سے مدد لینے کا متمنی ہو۔ چنانچہ جب وہ اپنے نظریہ کی تائید کے لئے کسی واقعہ یا حکایت کو مثلاً بیان کرتے ہیں تو ان کی یہ خواہش نمایاں ہو جاتی ہے کہ یہ مثالیں اور نمونے ایک طالب علم اور تاری کو اس رنگ میں تمثیل کر دیں جس کے مطابق وہ تعلیم و تربیت کا تانا بانا بننا چاہتے ہیں۔

غرضیکہ مذکورہ بالا تمام کتب و رسائل میں تعلیم و تربیت کے اسلامی و شرعی طریقوں اور نظاموں کو بیان کیا گیا ہے، اور ساتھ ساتھ مختلف قسم کے پند و نصائح اور اقوال و فوائد کا اضافہ کیا گیا ہے جنہیں اس دور کے مؤلفین نے بحفاظت و وقت ضروری سمجھا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اجر جزیل عطا کرے۔ ان کے مقاصد نیک تھے اور انہوں نے عصری تقاضوں کے مطابق ہر متعلقہ مسئلے کو اپنے نظام تعلیم میں شامل کر کے عوام کی ضرورت کو پورا کر دیا۔

تعلیم و تربیت میں علم نفسیات کی اہمیت مسلم ہے۔ اس بارے میں ہم بلا خوف تردید یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ نفس بشری کے اندرون کے متعلق اس طبقہ کی معلومات ہمہ جہتی تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ معلومات وسیع نہ تھیں محدود تھیں، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ تعلیمی مراحل میں درجہ بندی کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ طلبہ پر نرمی و شفقت کی نصیحت کرتے ہیں اور ان پر سختی کرنے سے روکتے ہیں۔ ان کا طریقہ تربیت تربیب کی بجائے ترغیب کے اصولوں پر مبنی ہے۔ اور ان کے ہاں طلبہ کی نگہداشت کے لئے اور ان کی فطری و خدا داد صلاحیتوں کو جانچنے کے لئے عمدہ ہدایات موجود ہیں۔

اب دوسری طرف آئیے۔ ہم عالم اسلام کے بیدار مغز تربیت کاروں کو تین طبقات میں تقسیم کر سکتے ہیں:-

- ۱۔ طبقہ فقہاء و محدثین:- اکثر مغربی مرتبین اسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا نظام تعلیم ابہام و تعقید سے پاک اور آسان فہم ہے۔ لیکن صرف نو عمر بچوں کی تعلیم و تربیت تک محدود رہے۔
- ۲۔ طبقہ نظار و فلاسفہ:- اس طبقہ سے مشرق کے علمائے تربیت منسوب ہیں۔ ان کے بعض طریقے تعقید و اشکال سے خالی نہیں۔

۳ - طبقہ صوفیاء :- ان کے طریقے کثیر ہیں۔ ان میں سے اکثر حضرات اپنے تلامذہ کو خلفائے راشدین کے دستور العمل کو اپنانے کی تاکید کرتے ہیں۔

المدرسة المشرقية :- مغرب کے علمائے تربیت کے طبقات اور ان کے مذاہب

تربیت کی بات ہو چکی۔ اب ہمارے ذمہ مشرق کے علمائے تربیت اور ان کے مذاہب تربیت پر ایک مستقل فصل قائم کرنا باقی رہ گیا ہے۔ مشارق سے ہم وہ فلاسفہ، اہل نظر اور علمائے تعلیم مراد لیتے ہیں، جن کا مولد و منشأ مشرق ہے۔ جس کا نقطہ آغاز عراق اور مضافات عراق ہے۔ ہم انشاء اللہ فصل ہذا یا فصل مابعد میں مشرق اور مغرب کے مذاہب تربیت کے مابین چند اہم اختلافات و امتیازات کی نشان دہی کریں گے۔ نیز بتائیں گے کہ مولد و منشأ اور ماحول کے وہ کون سے اثرات ہیں جو ان اختلافات کے ظہور کا سبب بنے۔

عراق کے ماحول اور بلاد افریقہ و مغرب کے ماحول میں ایسے امتیازات موجود ہیں جنہیں ماحول نہیں کہا جاسکتا۔ مثلاً خالص اسلامی علوم دیگر بلاد اسلامیہ کی نسبت سب سے پہلے عراق میں مدون ہوئے۔ اور خارجی علوم مثلاً فلسفہ، منطق، ریاضی، ہیئت اور نجوم وغیرہ اولاً اسی علاقے میں درآمد کئے گئے۔ چنانچہ ان دونوں ثقافتوں کی اصول و تشریح کی کتابیں اولاً اسی جگہ معرض وجود میں آئیں۔ پھر عراق ہی سے نکل کر یہ علوم تمام دنیا میں منتقل ہوئے۔ اور مختلف علاقے ان کی نشر و اشاعت کا مرکز بن گئے۔ لہذا صرف تعلیم و تربیت ہی کا ایک مسئلہ نہیں بلکہ اگر زندگی کے جملہ شعبہ جات میں اہل عراق کا نقطہ نظر دوسروں سے مختلف نظر آئے تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ ذرا سے غور و فکر سے واضح ہو جائے گا کہ ان کا یہ باہمی اختلاف اسی قدر ہے جتنا کہ استاد اور شاگرد میں ہوتا ہے۔

دولت عباسیہ کے آغاز کار میں اہل عراق جن علمی و ادبی موضوعات پر تصنیف کے میدان میں دوسروں سے آگے نکل گئے، تعلیم و تربیت بھی انہیں میں سے ایک ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ابن مقفع کی کتب مثلاً ”الادب الکبیر“، ”الادب الصغیر“ (یہاں لفظ ”ادب“ بمعنی تربیت ہے) — یا کتب جاحظ مثلاً ”البيان والتبيين“ کا جائزہ لادبی ہے۔ جاحظ کو پڑھنے والا اس کی اکثر کتابوں میں استادوں کے اخبار و لطائف بکثرت دیکھے گا۔ نیز عہد مامون اور اس سے ماقبل و مابعد

فلسفہ تربیت کے بارے میں یونانی، سریانی اور فارسی زبانوں سے بہت ساری کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ پھر جب مذہبی فرقوں اور مکاتب فکر نے تفحیل پائی تو انہوں نے اس موضوع پر خصوصی توجہ دی۔ چنانچہ اخوان الصفا نے اپنے رسائل میں آداب تربیت پر جو کچھ لکھا ہے کم نہیں۔ اس کے بعد ابو نصر فارابی کی کتاب "احصاء العلوم" ہے۔ اس میں اس نے علوم کی ترتیب و تدوین سے بحث کی ہے۔ اور مختلف مقاصد کے لئے اس کے مختلف اسالیب و مذاہب کو بیان کیا ہے۔ فارابی سے متصل ابن مسکویہ کا زمانہ ہے۔ اس نے تعلیم و تعلم کے میدان اصلاح و تہذیب کے جملہ طرق و تدابیر کے موضوع پر اپنی کتاب "تہذیب الاخلاق و تطہیر الاعراق" تالیف کی، جس میں یونانی فلسفہ بھی بیان کیا لیکن ساتھ ہی یہ نصیحت بھی کر دی کہ اسلامی زندگی کی ترقی میں کوشاں رہتے ہوئے آداب ملت اور احکام شریعت سے آراستہ ہونا چاہیے اور فرائض کو باحسن وجہ ادا کرنا چاہیے، اس کے بعد ہی فلسفہ پر نظر ہو سکتی ہے۔ ابن مسکویہ نے فلسفہ کے طالب علموں کی رہنمائی کے لئے بھی شاندار کتب تالیف کی ہیں۔

ابن مسکویہ کے معاصر فلاسفہ کی تعداد کثیر ہے۔ ان میں مشہور ترین بلکہ تمام فلاسفہ اسلام میں سب سے زیادہ مشہور رئیس شیخ ابو علی ابن سینا ہے۔ اس کی سماعی جس طرح علوم و فنون کے لئے متواتر اور پیہم تھیں اسی طرح اس نے تعلیم و تربیت کی اصلاح و ترقی کی طرف بھی نمایاں توجہ دی۔ گزشتہ پانچ سال سے دنیا کی تمام یونیورسٹیاں اور مجالس فکر و ادب اس کی ہزار سالہ برسی منا رہی ہیں۔ اور اس مناسبت سے ان کی طرف سے ابو علی ابن سینا کی شخصیت اور کام کے بارے میں کثیر شجر بھی شائع ہوا ہے۔ ابن سینا ایسے ہی وسائل کے ذریعہ آج تک زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ کیونکہ وہ انہی بات سے ایک مستقل اور جاندار مکتب فکر بن چکا ہے۔

اگر ہم مشرق اور عراق کے فلاسفہ تربیت اور حکمائے تہذیب کی نام شماری کرنے لگیں تو بات بڑھ جائے گی۔ البتہ ایسے لوگ جنہوں نے اپنی زندگیاں اس کارِ عزیز میں صرف کر دیں اور انہیں فن تعلیم و تربیت کی ترتیب و تدوین اور اس پر تصنیف و تالیف سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ تھا، ہمارے لئے ناقابل فراموش ہیں۔ ان کے سرخیل امام ابو حامد محمد بن محمد الغزالی ہیں۔ ان کی

کتابیں بچوں اور بالغوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق مختلف قسم کی ہدایات سے بھرپور ہیں۔ ان کی احیاء العدمہ اور ایہا الولد اس موضوع پر عمدہ ترین کتابیں ہیں۔ اور میزان العلم میں بھی تربیت کے دائرہ کار پر بحث کی گئی ہے۔ یہی حال فاتحۃ العلوم کا ہے۔ الغزالی التربیۃ اور التعلیم کے لحاظ اپنی کتابوں میں کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن دیگر علماء نے بھی ان الفاظ کو کم استعمال نہیں کیا ہے۔ بلکہ ان کا ایک ایسے شخص کی زبان سے صادر ہونا جو بغداد کے مشہور مدرسہ نظامیہ کے دسویں صدی کے چند اکابر اساتذہ میں سے تھا کچھ تعجب خیز بھی نہیں۔ پھر کثیر لوگوں نے فقہاء و محدثین کے طریقہ پر الغزالی کی پیروی کی۔ مثلاً:-

۱۔ المادۃ فی نے اپنی کتاب ادب الدنیا والدین میں۔

۱۔ الغزالی فرماتے ہیں (میزان العلم ص ۶۸): تخلیقات النبیہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جس میں ہمارے فعل کا اثر نہیں ہوتا۔ جیسے افلاک و کواکب۔ اور دوسری قسم وہ ہے جس میں فطری طور پر مبالغہ کمالات کے لئے قوت قبول رکھی گئی ہے۔ مگر تربیت کا لحاظ شرط ہے۔ جب کہ تربیت بھی اختیار سے متعلق ہو۔ مثلاً گھٹلی بذات خود نہ سیب ہوتی ہے نہ درخت۔ لیکن تربیت سے درخت بن جانے کی قابلیت اس میں بالقوة موجود ہوتی ہے۔ اور سیب بننے کے لئے قوت قبول نہیں ہوتی پھر گھٹلی سے درخت بننے کے لئے اس کی پرورش اور تربیت میں آدمی کا اختیار متعلق ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح اگر ہم چاہیں کہ غضب و شہوت کو بالکل ختم کر دیں تو ہم ناکام رہیں گے۔ لیکن اگر ہم ریاضت و مجاہدہ سے ان کو مغلوب اور تابع کرنا چاہیں تو ہم اس پر قادر ہو جائیں گے۔

۲۔ المادۃ فی نے اپنی کتاب میں تعلیم و تہذیب پر کئی فصلیں قائم کی ہیں۔ ایک فصل ان آداب پر مشتمل ہے جن سے متصف ہونا متعلم اور معلم دونوں کے لئے ضروری ہے۔ دوسری فصل کا عنوان یہ ہے: ”علماء کے لئے اہم ابتدائی آداب“۔ اس فصل میں المادۃ فی نے متاخرین علمائے تربیت کے منہاج پر خیالات ظاہر کئے ہیں۔ مثلاً اس نے لکھا ہے: ”اساتذہ کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ کسی متعلم پر سختی نہ کریں۔ کسی فوخیز کو مزا نہ دیں، اور کسی مبتدی کو ذلیل نہ کریں، تو اس کا دل تعلیم کے لئے آمادہ ہوگا۔ جذبات تیز ہوں گے۔ اور رغبت بڑھے گی۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

۷۔ الطبری نے اپنی کتاب مکام الاخلاق میں۔

۳۔ نصیر الدین طوسی نے اپنی جملہ کتب میں خصوصاً جس کا نام پہلے ”آداب البحث“ تھا اور بعد میں ”اخلاق نامری“ ہوا۔ اس کی اصل فارسی میں ہے اور اس میں بشری عادات و خصائل کی تحلیل و عدالت کے بارے میں مبسوط کلام کیا گیا ہے۔

۴۔ الشہر زوری نے رسائل الشجرۃ الالہیۃ میں۔

۵۔ زین الدین العاملی المعروف بالشہید الثانی نے اپنی کتاب منیۃ المرید فی آداب المفید و المستفید میں۔

اور ان کے علاوہ دوسری بہت سی کتابوں میں جنہیں تعلیم و تربیت اور آداب بحث و تحقیق میں مآخذ و مراجع کی حیثیت حاصل ہے، الغزالی کی پیسروی کی گئی ہے۔
اور جیسا کہ معلوم ہے سب سے پہلے مشرق میں علمی دور کا آغاز ہوا۔ اور مدارس کے لئے انواع و اقسام کی عالی شان عمارتیں اس طرح تیار ہوئیں کہ موجودہ دور کے مروجہ عمدہ ڈیزائن اکثر صورتوں میں

(بقیہ حاشیہ) ارشاد فرمایا ہے: تعلیم کے وقت سختی نہ کرو۔ سخت گیر کہلانے کی بجائے استاد کہلانا زیادہ بہتر ہے۔ ایک فصل میں الماوردی نے طالب علم کو معلم سے فضول بحث کرنے سے روکا ہے، خواہ طالب علم کے معلم سے کتنے ہی دیرینہ تعلقات ہوں۔ پھر الماوردی نے ان اعلیٰ آداب و اخلاق کا ذکر کیا ہے جن سے شہساف ہونا اساتذہ کے لئے لازمی ہے۔ مثلاً ذہانت و فطانت اور روح تربیت سے عمیق تعلق رکھنے والی دیگر خوبیاں، اس کے نزدیک معلم کو ایسی فراست کا مالک ہونا چاہیئے جس سے وہ معلم کی حد استعداد اور پائے استحقاق کو جانچ سکے تاکہ وہ اسے اتنا ہی دے جتنے کے لئے اس کی ذکاوت متحمل ہو سکے یا جس سے ہمارے غبی اور کند ذہن طلباء کی کمزوری میں کم از کم اضافہ نہ ہو۔ اس طریقے کو اختیار کرنے سے علماء کو مسرت حاصل ہوگی اور طلباء کو کامرانی۔
الماوردی کے ان خیالات کے ساتھ ابن خلدون کے عمدہ افکار بھی قابل توجہ ہیں۔ اس نے تربیت کار کو طبیب سے مشابہت دی ہے۔ طبیب حاذق مریضوں کا علاج ایک ہی طریقہ سے نہیں کرتا۔ بلکہ مرض عمر اور مزاج وغیرہ کا اختلاف ہمیشہ پیش نظر رکھتا ہے۔

ان سے کچھ زیادہ مختلف نہیں معلوم ہوتے۔ خصوصاً وہ عظیم الشان مدارس جنہیں سلاجقہ کے وزیر عظم نظام الملک نے پانچویں صدی ہجری میں اڈلائیشاپور میں اور ثانیاً بغداد میں قائم کیا، جو اسی کے نام سے منسوب و موسوم ہو گئے۔ اور جنہیں المدرستہ النظامیہ کہا جانے لگا۔ ان میں جملہ سہولتوں اور آسائشوں کا خیال رکھا گیا تھا۔ مثلاً اقامت گاہیں تھیں، وظائف تھے، لائبریریاں تھیں اور شاندار علمی روایات تھیں۔ وہاں سے جو مفکر علماء پڑھ کر نکلے ان کا شمار تمام اسلامی تاریخ کے محدودے چند علماء میں ہوتا ہے۔ پھر جب ان مدارس پر زوال آیا تو ساتویں صدی ہجری کے وسط میں مدستہ مستنصریہ جاری ہو گیا۔ جس کے کھدشات اپنی عظمت کی اور اپنے دورِ اول کی علمی تحریک کی جلالتِ شان و جبرگی کی ابد الابد ملک گواہی دیتے رہیں گے۔

ہمیں بچوں کی تعلیم و تربیت کے آداب اور معلمین و مودبین کے احوال کے متعلق نوادر و فوائدِ تاریخ اور ادب کی اکثر کتابوں میں آسانی سے مل جاتے ہیں۔ مثلاً الباحظ کی کتاب "البيان والتبيين"۔ ابن مقفع کے رسائل اور ابو حیان التوحیدی وغیرہم کی کتابیں۔ لیکن اس معاملہ میں فقہاء و محدثین اور ادباء و مصنفین کے درمیان یہ فرق ہے کہ پہلے طبقہ نے تربیت کی مشق علم و عمل کے دونوں پہلوؤں پر کی۔ اس میں خوب مہارت، بہم پہنچائی۔ اسے بطور پیشہ اختیار کیا اور پھر اس پیشے میں عظیم کامیابیاں حاصل کیں۔ اس طرح انہیں علمِ نفسیات میں وہ تجربہ حاصل ہوا جو آج کل کے ماہرینِ نفسیات کے روایتی علم سے کہیں زیادہ وسیع تھا۔ دوسرے طبقہ یعنی ادبوں اور انشائے پردازوں نے معلمین و مودبین کے لطائف و اخبار تحریر کئے اور ان میں ان کے اسالیبِ تربیت کی نشان دہی کی۔ مگر وہ محدثین و مفسرین اور فقہاء کی مانند خالص فنِ تربیت یا اصولِ تعلیم پر کوئی مستقل اور مکمل تصنیف نہ لکھ سکے۔

دولِ فاطمیہ، آتابکیہ و دیوبندیہ اور دولتِ ممالیک کی عظیم مساعی جو انہوں نے موصل، شام، فلسطین اور قاہرہ وغیرہ میں مدارس قائم کرنے کے لئے کیں، شک و شبہ سے بالاتر ہیں۔ اور جو مساعی بلادِ مغرب میں رو بہ عمل لائی گئیں بلاشبہ وہ بھی عظیم تھیں، لیکن اس کے باوجود پیشرویی و تجدیدی کی فضیلت کا سہرا مشرق اور مشرقِ وسطیٰ کے سر رہا، اور باقی حکومتوں اور ممالک نے ان کی ہمنوائی کی۔ اسی طرح ممالک، ان کے حالات، اور زمان و مکان کے اختلاف اور تفاوت کی بنا پر علمی تحریک کا

مزاج متاثر ہوتا رہا۔ اور تعلیمی روایات اور معیارات بدلتے رہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مشرق میں یہ معیار اکثر اوقات بلند رہا ہے۔ جب کہ اندلس اور مغرب میں اکثر اوقات علمی تحریک ساکن رہی۔ لیکن قرطبہ قیروان اور قاہرہ کا مختصر دور اس سے مستثنیٰ ہے۔ جس میں بلاد اندلس کے فلاسفہ ابن باجہ، ابن طفیل، ابن رشد اور غزالی وغیرہ سامنے آئے۔ اور انہوں نے بالآخر مشرقی حکماء و فلاسفہ کے مقابلہ میں دقیق تحقیقات اور وسیع کارکردگی کی بنا پر ایک امتیازی مقام حاصل کر لیا۔ کیوں کہ انہوں نے کبھی بھی محاکمہ ترجیح کو نظر انداز نہ کیا۔ صرف نقل و حجب پر اکتفا نہ کیا۔ بلاشبہ یہ علمی تحریک تحقیقی تالیفات کی تحریک تھی جو منگو لوں کے ہاتھوں مشرق کی تباہی کے بعد مصر میں منتقل ہو گئی تھی۔

دونوں مدارس کے باہمی فرقے کے بارے میں ابن خلدون نے کسے رائے :-

ابن خلدون نے بعض مستقل فصلوں میں اپنے زمانے کے مروجہ اصول تعلیم و تربیت پیش کر کے ان پر تنقید کی ہے۔ پھر آخر میں مشرق و مغرب کے باہمی فرق کو بیان کرنے کے لئے دونوں مقامات کے مروجہ متنوع نظاموں اور طریقوں میں باہم دگر موازنہ کیا ہے۔ اس نے پچشم خود دیکھا کہ مغاربہ کے ہاں متضاد روایات کی تطبیق کے لئے بحث مباحثہ پر بہت کم توجہ دی جاتی ہے، اور نقل اور حفظ کے سلسلہ کے باعث ان کے ہاں جمود کا مرض پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے خیال میں نقل و حفظ پر ان کی توجہ کا باعث ان کا سارے عالم سے کٹ کر دور ایک گوشہ عزلت میں سکونت پذیر ہونا تھا۔ وہ مغرب کے مناہج و ادضاع تعلیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور تحصیل و روایت کی خاطر مشرق کی طرف مغاربہ کے سفروں کی نشان دہی کرتے ہوئے کہتا ہے :

” واضح ہو کہ مغرب میں زوال حکومت اور عمرانی تباہی کے باعث باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ تقریباً ختم ہو گیا۔ اور اس وجہ سے کہ قیروان و قرطبہ مغرب اور اندلس کے صدر مقام تھے، ان کی آبادی دن بدن بڑھنے لگی اور وہاں علوم و فنون کے بازار گرم ہو گئے۔ لیکن جب یہ دونوں شہر بھی تباہ ہو گئے تو مغرب میں تعلیم کا سلسلہ رک گیا۔ صرف مراکش میں موحدین کے عہد تک خفیف سا اثر موجود رہا۔ قرطبہ و قیروان میں سلسلہ تعلیم کے انقطاع سے مغرب کے تمام علاقے اچھی تعلیم سے خالی ہو گئے۔ اور ان میں باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ باقی نہ رہا۔ اس سے ان کے لئے ملکہ پیدا کرنا دشوار ہو گیا “

ابن خلدون نے لکھا ہے کہ چونکہ مشارق کے طریقہ تعلیم کے برعکس مغاربہ کا طریقہ اسباق و مضامین

کو حفظ کر لینے پر موقوف ہے اس لئے یہ طریقہ معقیم ہے۔ وہ اس پر بحث کرتے ہوئے طلبہ مغربہ کے بارے میں کہتا ہے:-

”ان کے لئے حصول ملکہ اور حذاقت علمی سخت دشوار ہو گئے۔ کیونکہ حصول ملکہ کے راستے علمی مسائل مسائل پر باہمی گفتگو اور بحث و نظر میں سرگرم حصہ لینے سے ہی آسان ہوتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص حصول علم کی نیت سے ان کے مراکز علمی میں چلا جائے تو اسے معلوم ہو گا کہ وہاں کے طلبہ مجالس علمیہ میں ساری ساری عمر کھپانے کے باوجود کورے کے کورے رہتے ہیں۔ وہ حفظ پر ضرورت سے زیادہ توجہ دینے کے باعث اظہار اور افادہ علمی سے دور رہتے ہیں۔ اور مدت مدید تک تحصیل تعلیم کے باوجود ان میں حاصل کردہ علم کو استعمال کرنے کا ملکہ نہیں پیدا ہوتا۔ چنانچہ اگر آپ کو وہاں کے کسی فارغ التحصیل عالم سے ملنے کا موقع ملے تو آپ جان لیں گے کہ وہ افادہ و مناظرہ اور تدریس سے قاصر ہے۔ اس غامی کے اسباب مندرجہ ذیل ہیں:-

۱۔ غلط اصول تعلیم اور اتصال سند کا منقطع ہونا۔

۲۔ حفظ پر حد سے زیادہ ارتکاز توجہ۔

۳۔ ان کا یہ خیال کہ علمی ملکہ سے مقصود صرف حفظ ہی ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔“

ابن خلدون کے اس قول سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان اقدار میں مغربہ کی تعلیم کا مدار محض حفظ پر تھا۔ اس لئے وہ بے ثمر اور روح سے خالی تھی۔ جبکہ دوسروں کے طریقے بار آور اور ایجابی تھے۔ اور افراد و جماعات کی زندگیوں پر اس کے اثرات بہت عظیم تھے۔

مشارقہ اور فنون تعلیم:- ابن خلدون نے تمام فنون میں جن میں سرفہرست فن تعلیم ہے مشارقہ کی حذاقت و مہارت کو نمایاں طور پر بیان کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ وہ اس بارے میں ساری دنیا سے زیادہ ذہین اور طباع ہیں۔ حتیٰ کہ اہل مغرب کے دماغوں میں یہ بات راسخ ہو گئی ہے کہ مشارقہ فطرۃً بنی نوع انسان میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ ابن خلدون کے نزدیک یہ رائے ان علماء کی ہے جنہوں نے مشرق کا سفر کیا، وہاں کے لوگوں سے رابطہ بڑھایا اور ان سے علوم و فنون سیکھے۔ اس کے بعد جب وہ وطن لوٹے تو انہیں اہل مشرق کی فطری برتری کا یقین ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:-

”اہل مشرق فن تعلیم بلکہ تمام فنون و صنایع میں زیادہ ماہر ہیں۔ یہاں تک کہ حصول علم کے لئے مغرب سے مشرق کی طرف سفر کرنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ اہل مشرق کی فہم و فراست اہل مغرب کی فہم و فراست سے زیادہ ہے۔ اور وہ خود اپنی فطرتِ اولیٰ کی رو سے فطانت و ذکاوت میں ان سے کہیں بڑھ کر ہیں۔ ان کے نفوسِ ناطقہ اہل مغرب کے نفوسِ ناطقہ سے فطرۃً زیادہ عمدہ ہیں۔ اور وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ہمارا اور ان کا فرق حقیقتِ انسانیت کی رو سے ہے۔“

اگرچہ ابن خلدون کی یہ رائے مشارقہ کے حق میں ایک فیصلہ کن شہادت ہے لیکن آگے چل کر اس نے پھر مغاربہ کی فطرت کا دفاع کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مشارقہ اور مغاربہ کا باہمی تفاوت اس حد تک نہیں ہے۔ اور جنہوں نے مندرجہ بالا بات کہی ہے ان کا بیان مبالغہ سے خالی نہیں۔ ابن خلدون کے نزدیک اس تفاوت کی اصل وجہ مشرق میں حضارت و تمدن کا عروج اور مغرب میں ہلاوت کا غلبہ ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ یہ اس کی طرف سے ابلت و وطن کا ایک معقول دفاع ہے۔ کیونکہ ابن خلدون خود مغربی ہے۔ جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے وہ بربری نسل سے تعلق رکھتا ہے۔

الغرض ابن خلدون نے یہ نتیجہ تمام عالمِ اسلامی میں تعلیم و تربیت کے مختلف اوضاع کے مطالعہ اور مشارقہ و مغاربہ کے مابین اقوالِ مشائخ کے حفظ کے لئے ذہنی قوتوں اور دہی صلاحیتوں کا باہمی موازنہ کرنے کے بعد نکالا ہے۔ جسے آج سات سو سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس عہدِ بعید میں مذکورہ عادات و خصائل اور طبعی خواص آج بھی نہیں بدلے۔ بالکل اسی طرح جیسے ماضی اور زمان و مکان کے اثرات آج بھی اسی طرح کار فرما ہیں۔ چنانچہ ایک عراقی پیدا ہونے ہی اپنی گفتگو میں میانہ روی اختیار کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے بائے میں ہسٹلریٹ یا گونگے بن کا دم ہونے لگتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کی فطری گہرائی سے انکار ممکن نہیں۔ نیز آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے مصری بھائی اور بعض مغاربہ حفظ اور یادداشت میں دوسروں سے بڑھ ہوئے ہیں اور قوتِ ذاکرہ اور روانیِ گفتار میں اب بھی اسی طرح ہیں جس طرح ماضی میں ان کے آبلو و اجداد تھے۔